فرحت اللہ بیگ

(حالاتِ زندگی)

مرزا فرحت اللہ بیگ کے آباؤ اجداد بدخشاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے دادا کو مغل فرمانروا اکبر شاہ ثانی نے گورنر جنرل کے دربار میں اپنا بااختیار نمائندہ مقرر کیا تھا۔ اس اعتبار سے ان کے خاندان کا دلی کے معزز اور اہم گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔

فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دس برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں حاصل کی۔ پھر سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہوئے۔ اُسی زمانے میں اُنہوں نے مولوی نذیر احمد سے عربی پڑھی۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کے بعد ملازمت کی تلاش شروع ہوئی۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں پہلے رام پور گئے۔ پھر الٰہ آباد اور آگرہ کے چکر کاٹے۔ آخر حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں اُن کا خاندان مقیم تھا۔

۱۹۰۷ء میں چادر گھاٹ ہائی سکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ پھر مقابلے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ جس کی بنا پر اسپیشل مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ پھر ترقی کر کے ہائی کورٹ کے رجسٹرار اور ہوم سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور اِسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایسے دور میں ہوش سنبھالا۔ جب سماجی قدریں تبدیل ہو رہی تھیں۔ پرانی تہذیب کم و بیش ختم ہو رہی تھی؛ اور نئی تہذیب اپنے قدم جما رہی تھی۔ فرحت نے پرانی دہلی کی یادگاروں کو اپنے مضامین میں محفوظ کر لیا۔

وہ اُردو کے عظیم مزاح نگار تھے۔ اُن کی تحریروں میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اُن کی خوش بیانی کی وجہ سے اُن کا طنز بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ اِس میں تیز کاٹ نہیں ہوتی۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ زبان کے لطف، واقعات اور محاورات کے استعمال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان کی شگفتگی، گھلاوٹ اور مزاحیہ رنگ سے اُن کی تحریر میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔

فرحت کی زبان نرم و نازک ہے۔ جس میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ صاف ستھری اور بامحاورہ زبان لکھنے میں اُنہیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان میں لطیف مزاحیہ نگاری کی کمی محسوس کر کے اِسے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اور ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے ایک سلسلہ جاری کیا۔ جو اب کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ شاعری کے میدان میں بھی جولانی دکھائی ہے۔ ''میری شاعری'' کے نام سے ایک دیوان شایع ہوا۔ ''دہلی کا یادگار مشاعرہ'' اور ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی'' اُن کی مشہور تصانیف ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں دکن حیدر آباد میں وفات پائی۔

ایک وصیت کی تعمیل

(فرحت اللہ بیگ)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے فن سے روشناس کروانا۔
۲۔ طویل متنوں کی تلخیص سے روشناس کرانا۔
۳۔ فرحت اللہ بیگ کی شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے طرز سے آگاہ کرنا۔
۴۔ کسی موضوع کے حق یا مخالفت میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی مشق کرانا

خاص الفاظ و تراکیب: نگینہ ۔ راس نہ آنا ۔ تیر قضا کا ۔ بن بلائے مہمان ۔ یورش ۔ علمی مباحث ۔ غل غپاڑہ
قطعہ تاریخ ۔ شانِ نزول ۔ صراحت

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انہیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل ابھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، سیام فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پانجامہ، کتھی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا امیر حبیب اللہ خان اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں، اس وقت انہوں نے فرمایا۔ میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اِسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا''۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے، مرجائیے مضمون میں لکھ دوں گا''۔

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحیدالدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی۔ وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انہوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سو گئے ہم دونوں نے باتوں میں صبح کردی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحاتِ زبان اردو پر بحث ہوتی رہی، شعروشاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں، مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے، پھبتیاں اڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی، ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک ہی غل غپاڑہ رہا۔

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے، لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا۔ لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی، اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا، جو سچے دل سے اُن کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زودفہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔

بات یہ ہے کہ انہوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہوجائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر اِن مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ

لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا، انہوں نے ہر دفعہ یہی کہا۔ ''ارے میاں! گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا، اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے، سرسید کی خدمت میں سرگاڑی پاؤں پہیہ کیا، اب جو چند روپے مل رہے ہیں، تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے''۔

میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے۔ ''آگے ناتھ نہ پیچھے پگا''۔ مزے کیجیے۔ بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے، ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے''۔

وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے، ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔ جتنی اُن کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اُتنی ہی اُن کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا۔ جب اُن کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب' آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اِس کی صراحت، میں آگے چل کر، کروں گا۔ ہاں، ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے۔ اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہرحال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا، اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستے کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہو گئی، بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا، تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔

دوسرے روز ان کا لیکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی، پھر بھی بڑے میاں کو جوش آ گیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لیکچر

دینے کا دم نہ تھا، اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ انہوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے پیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لیکچر پڑھنا شروع کیا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہوجاتا ہے مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ اُن کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے۔ یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کررہی ہے۔ کئی برس گزر چکے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لیکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا، میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لیکچر انہیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو یہ لیکچر پڑھتے پڑھتے خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو، اس میں ان کا مدِ مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اُسی روز ایک واقعہ پیش آیا کہ اُس کا خیال کرکے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ ''۱۲۶۱ء میں دہلی کا ایک مشاعرہ'' اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے، اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کرکے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا ''یارو! ذرا جلدی کرو، دیر ہورہی ہے، مزا کرکرا ہوجائے گا۔ میں باہر جاکر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں، تمھارا کام جب ختم ہوجائے تو سیٹی بجا دینا، میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا''۔ اتنا کہہ کر میں فوراً باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کروں۔

جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مولف ''طبقات الشعرائے ہند'' سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انہی کے مکان پر نواب زین العابدین خان کی مدد سے ہوا تھا۔ چناں چہ میں نے اپنے لیکچر کی ابتدا میں اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے

دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اوران کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر اُن کے دہلی میں آ کر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اِس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا اس میں جمع ہوئے۔

میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا۔ کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحیدالدین سلیم کی طرف ہوگیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنے پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحیدالدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی، اب جو ہے، وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے۔ ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟''

مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اینٹھتے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے۔ ''فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا''۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا۔ جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہوسکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا، دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے کہاں کے تھے، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں، کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے''؟

کہنے لگے۔ ''تو گھڑی گھڑی، ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا''۔ مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہوجاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے''؟

بہرحال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا۔ ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟'' یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہوجاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے۔ ''جی ہاں' میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے''۔

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہوگیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے۔ ہائے اُن کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر

خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال، نہ بچہ، نہ نوکر، نہ ماما۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آتی۔ ''کون؟''

میں نے کہا۔ ''فرحت''۔ اُسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کُنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھر بار کا خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے، چائے بنائی، نمک کے ڈالے کو ڈال، دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے۔

کبھی بھی گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں، کہنے لگے ''نہیں بھئی، میں نے تو مدّتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے۔

تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی، پی لی۔ اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے، بان کی کُھری چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔

اُن کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ، اُس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے۔ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی

ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے جاتے، انہی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انہیں کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر اُن ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوج داری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انہوں نے شعر پڑھا، اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود اُن کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس شاعر کا، اب بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈنے بیٹھے اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے، اور اس اصل کے کیا معنے ہیں؟ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انہوں نے اِس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، انہیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہ رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحیدالدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا، ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اِسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتے۔

مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اُس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اُڑ واُڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ اُن کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد لکھ رکھیں کہ چاہے اِس سرے سے اُس سرے تک، ہندوستان چھان مارو، مولوی وحیدالدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، اُن کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

(مضامین فرحت)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مولوی وحید الدین سلیم سے پہلی ملاقات کے وقت مصنف کیوں پریشان تھا؟

ب) مولوی صاحب، فرحت سے ملاقات کا اشتیاق کیوں رکھتے تھے؟

ج) مولوی صاحب اخراجات میں اتنے محتاط کیوں ہو گئے تھے؟

د) اورنگ آباد پہنچنے پر مصنف اور مولوی وحید الدین سلیم کا کیسا استقبال ہوا؟

ہ) مصنف نے مولوی صاحب کی کن خوبیوں کا ذکر کیا ہے؟

و) سبق میں مولوی صاحب کی کونسی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے؟

ز) مصنف نے مولوی وحید الدین سلیم کے گھر کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے؟

ح) فرحت کی وجہ سے مولوی صاحب کے بارے میں کیا غلط فہمی پھیل گئی؟

ط) مولوی وحید الدین اصلاح سازی میں کس زبان کے اصولوں سے مدد لیتے تھے؟

۲۔ سبق کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' کا مصنف ہے۔

i) فرحت اللہ بیگ   ii) فارغ بخاری

iii) چراغ حسن حسرت   iv) پطرس بخاری

ب) بقول مصنف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولوی وحید الدین سلیم ہوتے چلے گئے۔

i) سخی   ii) ظالم

iii) کنجوس   iv) رحم دل

ج) مولوی وحید الدین صاحب یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔

i) علی گڑھ   ii) عثمانیہ

iii) دہلی   iv) پنجاب

ج) مولوی صاحب مصنف کے ایک سے بہت خوش ہوئے تھے۔

i) نظم
ii) غزل
iii) خاکہ
iv) قطعہ تاریخ

د) مولوی وحید الدین اور مصنف دونوں رہنے والے تھے:

i) حیدرآباد کے
ii) دہلی کے
iii) میرٹھ کے
iv) کلکتہ

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) مصنف کے ساتھ سفر میں مولوی وحید الدین سلیم مسلسل خاموش رہے۔
ب) مصنف اور مولوی وحید الدین سلیم کے درمیان سفر کے چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔
ج) مولوی وحید الدین سلیم صاحب اولاد تھے۔
د) مولوی وحید الدین سلیم محاورات وضع کرنے میں لاثانی تھے۔
ہ) مصنف اور مولوی وحید الدین دونوں ایک ہی شہر حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔

۴۔ متن کے مطابق خالی جگہ درست لفظ سے پُر کریں۔

الف) مولوی وحید الدین سلیم کو.........کا بڑا شوق تھا۔
ب) مولوی وحید الدین صرف.........سے ڈرتے تھے۔
ج) دورانِ سفر مصنف اور مولوی صاحب کے ساتھ.........تھے۔
د) بقول مصنف مولوی صاحب میں.........کا مادہ بہت تھا۔
ہ) مولوی عبدالحق نے مصنف اور مولوی صاحب کو.........شہر آنے کی دعوت دی تھی۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع.........بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے''۔

۶۔ خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۷۔ مصنف اور مولوی وحیدالدین سلیم کی پہلی ملاقات کا منظر اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۸۔ مصنف نے جس طرح ظریفانہ اور نرم انداز میں مولوی وحیدالدین سلیم کی خامیوں کو اُجاگر کیا ہے کیا آپ اس سے اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟

۹۔ اگر آپ مصنف کی جگہ ہوتے تو مولوی وحیدالدین سلیم کا خاکہ کس طرح کھینچتے؟

شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری

خاکہ کے معنی ''کسی چیز کا ڈھانچہ'' اور ''تصویر کی ابتدائی اور بنیادی لکیریں'' کے ہیں۔ اُردو ادب کی اصطلاح میں خاکہ وہ مختصر تحریر یا مضمون ہے جس میں کسی شخص کی شخصیت اور کردار کی بھرپور جھلک نظر آئے۔

خاکہ دراصل اُس شخص کی شکل وصورت اور کردار ونظریات کی ایک قلمی تصویر ہوتی ہے۔ ایک کامیاب اور اچھے خاکے کی تحریر کے مطالعہ کے بعد ہم کسی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ خاکے کو عام طور پر کسی شخصیت کا ایک مختصر اور ہلکا ادبی تعارف نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے طویل مضمون کی تلخیص کرائیں یا بطور خلاصہ ان سے مختلف سوالات کے جوابات لکھوائیں۔

۲) مباحثوں/ مذاکروں/ سیمیناروں میں شریک کروائیں اور کسی موضوع کے حق یا مخالفت میں دلائل اور آداب کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کروائیں۔

۳) فرحت اللہ بیگ کا کوئی اور خاکہ کمرہ جماعت میں سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔

۲۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی اہمیت بتا دیں۔

۳۔ فرحت اللہ بیگ کے اسلوبِ تحریر پر لیکچر دیں۔

۴۔ اُردو ادب میں فرحت اللہ بیگ کے مقام سے آگاہ کریں۔